آپ بیتی، یادداشتوں اور ڈائری کے ترجمے کے مسائل

ڈاکٹر فاخرہ نورین

Abstract:

Autobiography ,memoires and diary are questionable genres of non-fiction in terms of validity and truthfullnes.Thy are alike in a way ,as purpose for writing all three of them is to be a source of inspiration and a guiding star for others. Translator of autobiography ,memoires and diaries have to fight a war against prejudice.Use of personal details, hints ,synbols and a specific sense of language make his task of translation a complex enigma.Publication and translation of such texts is driven by prejudices of followers or enenmies. Such texts are altered on a vast scale .Translator needs to take care and be aware of these prejudices of others as well as his own.

آپ بیتی، یادداشتیں اور ڈائری اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جیسی ہی اصناف ادب ہیں جو کسی فرد کی اپنی ذات اور گردوپیش کی زندگی کو قلم بند کرنے کی ایسی کوششیں ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے صاحب تصنیف کے تجربات حیات سے مستفید ہو سکیں۔اگرچہ یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ ہر شخص کی زندگی سے ممکن ہے کسی کو کوئی سبق نہ مل سکے۔مگر ایسے لوگ جو ایک پرجوش اور فعال زندگی گزارتے ہیں اور اپنے عہد کی تاریخ ساز شخصیتوں میں شمار ہوں انھیں چاہیے کہ وہ اپنی خودنوشت ضرور لکھیں۔لیکن ایک سوال جو یہاں پہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا کوئی بھی شخص اپنے اوپر بیتے ہوئے تمام حالات وواقعات کو قلم بند کر پائے گا؟

یادداشتیں اور ڈائری بھی صاحب تصنیف کی خودنوشت ہوتی ہیں البتہ خودنوشت سے اس لیے قدرے مختلف ہو جاتی ہیں کہ وہ انتہائی ذاتی نوعیت اور عموماً ذاتی تزکیہ نفس کے لیے ہی لکھی جاتی ہیں۔اس میں زیادہ تر مصنف اپنی یادداشت اپنے نقطہ نظر یا حالات وواقعات اور چیزوں کو اپنے فہم کے مطابق سمجھ کر لکھتا ہے۔چونکہ ایک ہی واقعے کو

ہر شخص اپنے انداز میں اپنے نقطہ نظر کے مطابق سمجھے گا لہٰذا یادداشتیں اور ڈائری اس کی ذات کا زیادہ واضح اور قریبی عکس ہوتی ہیں۔ جبکہ خودنوشت چونکہ بالارادہ دوسروں کے لیے لکھی جاتی ہے اس میں اخفائے ذات اور حقائق بہت زیادہ ہوتا ہے۔

غیر افسانوی اصناف ادب چونکہ حقائق کی پیش کش اور ان کو محفوظ رکھنے کی خصوصیت رکھتی ہیں ان کا ترجمہ بھی اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہی کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی دوسری زبان یا ثقافت سے واقفیت کا ایک اہم ذریعہ اس زبان کے مشاہیر سے واقفیت بھی ہے۔ کسی ثقافت کی تفہیم ان اصولوں اور کسوٹی سے بھی ممکن ہے جس پر پرکھ کر وہ کسی کو اپنے مشاہیر میں شامل کرتی ہے۔ ترقی کے دو ہی طریقے ہیں یا تو خود نت نئے تجربات سے گزرا جائے اور یا پھر دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھا کر یہ مراحل جلد طے کر لیے جائیں۔ اسی سوچ کے پیش نظر آپ بیتیوں، یاد داشتوں اور ڈائریوں کے تراجم کیے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں مشاہیر عالم کی ذاتی زندگی، ان کے حالات اور معمولات ہمیشہ سے دلچسپی کا مرکز رہے ہیں۔ سچ بہر حال افسانے سے زیادہ دلنشیں اور دلپذیر ہوتا ہے لہٰذا افسانوی ادب کے ترجموں سے بھی زیادہ خودنوشت، ڈائری اور یادداشتوں کے ترجمے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے ہیں۔ ان اصناف کی تحریر جتنی متنازعہ ہے ترجمہ اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔

اگر چہ غیر افسانوی ادب حقائق کی ترسیل ہے لیکن کیا کسی شخص کے لیے ممکن ہے کہ وہ اپنے بارے میں اپنی محبت کے خول سے نکل کر خوف خلق خدا سے بے نیاز ہو کر وہ سب کچھ لکھ دے جو آپ بیتی کہلانے کی حقدار ہو؟ خود نوشت آپ بیتی لکھنا مشکل کام ہے ہاں البتہ

> ....اپنی ایک خاص قسم کی سوانح عمری (یعنی اپنے سوانح زندگی) لکھی جا سکتی ہے..........
> اپنی سوانح عمری لکھ کر بھی ضروری نہیں کہ کوئی شخص آپ بیتی لکھ سکے۔ اپنی سوانح عمری اس حد تک ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص اپنی زندگی کے چیدہ چیدہ واقعات لکھ دے یا زیادہ سے زیادہ تھوڑی دور تک ان کی باطنی محرکات کا بیان بھی کر دے جو اس پر اور اس کے دل پر گزری ہے۔ ایک لحاظ سے آپ بیتی یا خودنوشت سوانح عمری کی صنف دوسروں کی لکھی ہوئی سوانح عمریوں کے مقابلے میں خاصی نارسا اور ناقص چیز ہوتی ہے۔(۱)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مترجم اس ناقص اور نارسا چیز میں کوئی تبدیلی کر سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مترجم متن کا پابند ہے وہ اپنی طرف سے حقائق میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ یہ کام نقادوں اور شارحین کے لیے چھوڑ دیا جانا چاہیے لیکن ایسے عوامل موجود ہیں جو مترجم کو اس تبدیلی کے لیے مجبور کرتے ہیں۔ یہ عوامل، ادبی، ثقافتی اور مصنف کے ذاتی بھی ہو سکتے ہیں۔

ڈائری، خودنوشت اور یادداشتوں کے ترجمے میں مترجم کو یا تو وہ تصویر پیش کرنی پڑتی ہے جو مصنف کی مرضی کے مطابق ہوگی یا اسے یہ تصویر بنانی پڑتی ہے مثلاً اگر کوئی سیاسی جماعت کسی خاص رہنما کی خودنوشت یا ڈائری کو ترجمہ کروائے تو وہ ان فروگذاشتوں اور انسانی لغزشوں کا ذکر یا ان کی طرف کیا گیا ہلکا سا اشارہ بھی ترجمے میں شامل

نہیں ہونے دے گی جس سے اس رہنما کی تصویر کے رنگ ذرا بھی مدھم پڑنے کا خدشہ ہو اور چاہے خود اس نے ان فروگذاشتوں کا ذکر کیا ہو۔خودنوشت، یادداشتوں اور ڈائری کے ترجمے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ پیش آتی ہے کہ ممکن ہے صاحب کتاب نے ان میں اس سطح کا اسلوب اور فن کارانہ چابکدستی نہ دکھائی ہو جو عموماً اس سطح کے آدمی سے توقع کی جاتی ہو تو مترجم اس کو ادبی اسلوب یا کوئی منطقی ربط عطا کر کے اسے غیر افسانوی ادب کا ایک شاہکار بنانے کی سعی کرتا ہے۔ یہ اگرچہ حقائق کو تو مسخ نہیں کرے گا بلکہ انہیں ایک ربط اور رشتہ وادبی زبان وبیان عطا کر کے زیادہ قابل فہم بنا کر ادبیت بخش دے گا۔ لیکن یہ بھی ادبی خیانت اور بد دیانتی میں آئے گا کیونکہ یہ مصنف کی ذہنی رو اور نفسیات، الفاظ وتراکیب کے ورتارے اور اس کی مخصوص صرفی ونحوی عادات کو چھپانے کا عمل ہے۔

> ....بازتخلیق کاروں نے کسی مصنف، فن پارے، عہد، صنف اور بعض اوقات پورے ادب کی شبہات تخلیق کی ہیں۔ یہ تصاویر اپنے مقابل حقائق کے پہلو بہ پہلو وجود رکھتی ہیں۔ لیکن یہ شبہات ہمیشہ اپنے مماثل حقائق کی نسبت زیادہ لوگوں تک پہنچتی رہیں اور اب بھی یقیناً ایسا ہی ہے۔ ....بازتخلیقات کسی مخصوص نظریاتی اور/یا بوطیقائی دھاروں کے مخالف یا ان کے تحت بندشوں میں پیش کی جاتی ہیں......(۲)

یعنی ممکن ہے کہ اصل مصنف نے جو تصویر پیش کی یا کرنا چاہی ہو ترجمے کے بعد تصویر اس کے بالکل الٹ بن جائے۔ یہ تبدیل شدہ تصویر یا تصور اس ایڈیٹنگ کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جو بعض اوقات مصنف خود کرتا ہے، کبھی اس کے رشتے دار اور ان سب سے زیادہ مترجم۔ کیونکہ مترجم جس ادبی نظام اور قاری کے لیے یہ خودنوشت، یادداشتیں یا ڈائری ترجمہ کر رہا ہوتا ہے اس میں کوئی مناسب مقام پانے کے لیے وہ یہ تبدیلیاں کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک تبدیلی کے متعلق تو پچھلے صفحات میں بات ہو چکی ہے کہ مترجم اس کے اسلوب کو تبدیل کر کے اسے ادبیت عطا کر سکتا ہے۔

چارلس ڈارون اپنے نظریات کی بدولت ایک متنازع مگر مشہور شخصیت ہے۔ "Autobiography of charles Darwin" ان کی خودنوشت سوانح ہے جس کا مقصدِ تحریر ڈارون نے تو وجہ تحریر ایک جرمن ایڈیٹر کی فرمائش کو قرار دیا مگر ان کے بیٹے مرینس ڈارون نے اس کے برعکس قرار دیا اور لکھا:

ترجمہ:

> میرے والد نے اپنی یادداشتوں پر مبنی یہ خودنوشت اپنے بچوں کے لیے لکھی تھی۔ اسے تحریر کرتے وقت ان کے ذہن میں یہ بات نہیں تھی کہ اس کی کبھی اشاعت بھی ہو سکے گی۔ بہت سے لوگ شاید یہ بات تسلیم نہ کریں لیکن ایسے لوگ جو میرے والد سے واقف ہیں یقیناً اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ وہ ایسے ہی شخص تھے۔ اس خودنوشت کا عنوان ہے ''میرے ذہن اور

> کردار کی نشو ونما پر مبنی یادداشتیں" اور اس کا اختتام ان الفاظ پر مشتمل ہے۔"۳ اگست ۱۸۷٦ء میں نے اپنی زندگی کا یہ خاکہ ۲۸ مئی سے ہوپڈن (Hopedene) کے بنام کے دوران خط تحریر میں شروع کیا اور اس کے بعد سے اکثر سہ پہر ایک گھنٹہ تک اسے لکھتا رہا۔" یہ بات آسانی سے سمجھی جا سکتی ہے کہ ایک شخص کے ذاتی واقعات اور دل کی باتیں اس کی بیوی، بچوں کے لیے ہی لکھی جا سکتی ہیں۔ بہت ہی ذاتی حصے اس خودنوشت سے نکال دیے گئے ہیں اور میں اسے ضروری نہیں سمجھتا کہ اس جگہ کی نشاندہی کی جائے جہاں سے وہ حصے نکالے گئے ہیں۔ بہر حال کہیں کہیں بیانیہ سہو کی درستگی ضرور کر دی گئی ہے جو بہت ہی معمولی نوعیت کی تھی۔(۳)

ڈارون کی خودنوشت میں اس کے اپنے لکھے ہوئے صفحات کے مساوی ہی صفحات کے دو ضمیمے اس کے بیٹے کے ہاتھوں کے تحریر شدہ ہیں۔اس سب کے نتیجے میں ڈارون کا جو تصور سامنے آتا ہے وہ اپنے کام میں ہر وقت منہمک ایک ایسے سائنس دان کا ہے جس کی کوئی ذاتی زندگی، خواہشات یا سوچ نہیں ہے۔ دوسری طرف فرینس کے ضمیمہ جات سے ڈارون ایک مشفق اور فرشتہ صفت باپ کے طور پر سامنے آتا ہے جس کی زندگی میں بچوں کی سی معصومیت اور دوسروں کا خیال رکھنے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ ڈارون جو ایک مرد ہے، جو ایک خاوند ہے اور دنیا کے مشہور انسانوں میں سے ایک ہے، اس کی کوئی جھلک قارئین تک نہیں پہنچ پائی۔مترجم بھی ڈارون کی شخصیت کے اس پہلو پر ایک جملہ لکھتا ہے:

> خوشگوار شادی شدہ زندگی اور بچوں پر گفتگو کے بعد وہ مزید لکھتا ہے۔
>
> تین سال آٹھ مہینے لندن میں قیام کے دوران میں بہت کم سائنسی کام کر سکا حالانکہ میں نے امکان بھر سخت ترین محنت کی۔(۴)

گویا مترجم نے بھی ان تفصیلات کو جو اس پر بطور رشوہر یا بطور والد روشنی ڈالتی تھیں، حذف کر کے اس کی بطور سائنس دان زندگی کو اہمیت دی ہے۔

دوسری بڑی تبدیلی جو اسلوب میں کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ کہ مترجم خودنوشت کو کہانی اور افراد کو کردار بنا دے۔یادداشتوں اور ڈائری کے اندراجات کو پلاٹ کی شکل دے کر انہیں کسی اور صنفِ ادب میں تبدیل کر دیا جائے۔ یہ تکنیک خودنوشت کی تحریر میں بھی نظر آتی ہے۔مثلاً اردو میں اس کی عمدہ مثال ممتاز مفتی کی "علی پور کا ایلی" ہے جو خودنوشت ہونے کے باوجود ناول کی فارم میں ہے اور اس کا مترجم اگر چاہے تو بہت آرام سے اس کو ناول ہی بنا کر پیش کر سکتا ہے۔

خودنوشت، یادداشتوں اور ڈائری کا مترجم اگر کوئی قریبی رشتہ دار یا عقیدت مند ہو تب بھی ترجمے میں ممکن ہے کہ وہ اپنی زبان کی واقفیت کا فائدہ اٹھائے اور حقائق و واقعات کو کچھ کا کچھ کر دے۔اس کی ایک قابلِ ذکر مثال آندرے لیفیور نے اپنے مضمون Translation: On the construction of different Anne Franks.(۵) میں دی ہے جس میں این فرینکس کے والد نے اپنی بیٹی کی ڈائری کے مندرجات میں تبدیلی کرتے

ہوئے خود جرمن میں مسودہ لکھ کر دیا اس مسودے میں این کی جنسی معاملات سے واقفیت اور ان پر تفصیلی اظہار خیال کے علاوہ اس کی ڈائری کے ہر اس اندراج کو حذف کر دیا گیا ہے جو این فرینکس کے 'درجے' کی عورت کے شایان شان نہیں ہیں یا جنگ عظیم دوم کے بعد اس کے والد کے خیالات ونظریات سے ہم آہنگ نہیں تھے۔

اگر چہ مترجم محض متن کی حدود میں رہتے ہوئے متن سے وفاداری کا پابند ہوتا ہے مگر مترجم بھی کسی معاشرے کا باشندہ اور کسی ادبی نظام کی اخلاقیات کا پابند ہوتا ہے۔لہٰذا جب ان بندشوں میں جکڑا وہ ترجمہ کرنے لگتا ہے تو اس کے سامنے اس کے وہ قارئین بھی ہوتے ہیں جن کے لیے وہ ترجمہ کر رہا ہوتا ہے۔ مثلاً اگر وہ کوئی کتاب امریکی قارئین کے لیے ترجمہ کر رہا ہے اور اصل مصنف کا تعلق جاپان سے ہے جو اپنی خودنوشت میں جاپان پر ایٹمی حملے کے بعد امریکی پالیسی اور حکومت پر سخت تنقید کرتا ہے، لامحالہ مترجم کو ترجمے میں یا تو امریکہ کی جگہ کسی اور ملک کی پالیسیوں پر تنقید کرنی پڑے گی اور یا پھر ان اقتباسات ہی کو حذف کرنا پڑے گا! دونوں صورتیں ہی ترجمے میں تبدیلی کا سبب بنیں گی مگر چونکہ قاری یا خریدار ترجمے میں براہ راست تبدیلی کا سبب بنتے ہیں اور ان کی سرپرستی کے بغیر نہ تو کوئی ناشر کتاب چھاپنے کو تیار ہو گا نہ یہ مترجم ترجمہ کر پائے گا لہٰذا قارئین کا ذوق اور ذہنیت بہت حد تک مترجم کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ترجمے میں تبدیلی کر دے۔ اسی سلسلے میں ایک اور تبدیلی تو یہ آتی ہے کہ اگر مصنف اور مترجم یا مصنف کی عمر اور ذوق میں فرق ہو تب بھی متن کے ترجمے میں تبدیلی کر دی جائے گی۔ مثلاً این فرینکس ہی کی مثال کو آگے بڑھایا جائے تو اس کی ڈائری کے مندرجات میں تبدیلی کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ اس عمر کی لڑکی سے اس درجہ عقل اور خصوصاً جنسی زندگی کے شعور کی توقع نہیں کی جاتی۔ این کی ڈائری کو اردو میں ترجمہ کرتے ہوئے اردو کا مترجم اس کے ان تمام بیانات کو جو حیض، جنسی خودلذتی اور جنسی آگہی سے متعلق ہیں، دو وجوہات کی بناء پر حذف کر جائے گا یا کم از کم ان کو رموز وعلائم کی دبیز چادر اوڑھانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اولاً یہ کہ مشرق کے عائلی نظام میں چودہ سال کی لڑکیوں کے دور بلوغت میں داخل ہو جانے کے باوجود اس درجہ آگہی کی گنجائش یا قبولیت نہیں ہے دوسرا یہ کہ اردو کے آپ بیتی نگار کے ساتھ ساتھ مترجم بھی۔

> ....مشرق میں بیٹھا ہے جہاں اس کے لیے ممکن نہیں کہ سچائی یا سچی تصویر کشی کی آڑ لے کر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتا پھرے۔ اور حقیقت تو یہ ہے بداعمالیوں کی تشہیر کی یہ حرکت خود مغرب کو بھی مہنگی پڑی ہے۔ بالآخر یہ ہوا کہ لغزش کو تقاضائے بشریت سمجھنے کی بجائے بشریت کا زیور بنا لیا گیا۔
>
> ناول اور سوانح عمری میں حقیقت نگاری کی تحریک بہت مقبول ہونے کے باوجود اس بڑے نتیجہ سے نہ بچ سکی کہ حقیقت نگار بالآخر انسانیت کے کیڑے نکال کر، اپنی دوکان چمکانے والا ثابت ہوا۔ حقیقت نگار مصوروں کا بھی آخر یہی حال ہوا کہ اچھے بھلے معقول آدمی ہونے کے باوجود گھناؤنے اور فرومایہ (sordid) موضوعات میں دلچسپی لینے لگے اور اب حقیقت نگاری پستی اور فرومائیگی کی ہم معنی اصطلاح معلوم ہو رہی ہے۔

> مقصد یہ ہے کہ اردو میں سچائی کے نام سے بدی کی ترغیب کا کاروبار کچھ زیادہ چمکا نہیں کیونکہ یہاں بدی کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا جاتا جس کی تشہیر کی جائے۔(۶)

خودنوشت، یادداشتوں اور ڈائری کے ترجمے میں لسانی سطح پر درپیش مسائل میں مترجم کی لسانی فہم اور خصوصاً مصنف کی استعمال کردہ زبان کی فہم کی قابلیت ہے۔ خودنوشت میں تو ممکن ہے کہ مصنف حتی الامکان اسلوب اور زبان کے مروجہ استعمال کو مدنظر رکھے لیکن ڈائری اور یادداشتیں چونکہ مصنف کی ذاتی یاددہانی کے لیے لکھی گئی چیزیں ہیں ان میں لسانی ابہام کی موجودگی کی زیادہ گنجائش ہے۔ مثلاً وہ روزنامچے:

> جن میں اصلی ناموں کی جگہ ناموں کے حروف اول لکھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً 'س' نے کہا اور 'ع' سے میری یوں بات ہوئی، 'ذ' نے یہ فرمایا اور 'ن' نے یوں بات کاٹ دی۔ دراصل یہ سب کچھ اپنی یادداشت کی حد تک تو ٹھیک ہے اور کسی حد تک دوسرے سوانح نگار کے لیے اچھا مواد ہے مگر مستقلاً یہ کوئی خاص چیز نہیں۔ ایسے روزنامچے اپنی ہی خلوت میں دہرانے کے لیے تو ٹھیک ہیں مگر دوسروں کے لیے اس قسم کی رموز بے معنی ہو جاتی ہیں۔(۷)

مترجم کو اول تو صاحب کتاب کے حالات زندگی سے آگہی ہونی چاہیے اس مقصد کے لیے اس کے سوانح پڑھنا مفید ثابت ہوگا تا کہ وہ ان علامات سے مراد اشخاص کی پہچان کر سکے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مترجم ان علامات کی جگہ اصل ناموں کا اندراج کر دے؟ شاید اس معاملے میں بہترین طرزِ عمل یہ ہو سکتا ہے کہ مترجم حاشیے میں ان علامات میں مستور افراد کے ناموں کا ذکر کر دے اور اگر اس کا تحریری ثبوت کسی اور سوانح عمری یا مکتوب وغیرہ کی شکل میں موجود ہے تو اسے کتاب کے ضمیمہ جات میں شامل کر دے۔ اگرچہ یہ وضاحت مترجم کا کام نہیں بلکہ محقق یا نقاد کا ہے لیکن مترجم کا فرض حقائق کی ترجمانی اور ابلاغ ہے جس کی بدولت وہ اپنی بساط بھر کوشش اپنے فریضے کے دائرے سے باہر جا کر بھی کر سکتا ہے۔

بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے معالج کرنل الٰہی بخش کی یادداشتیں یا روزنامچہ "With the Queid-e-Azam during his last days" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ مصنف کو قائد اعظم کی بیماری کی شدت کے پیش نظر معالج مقرر کیا گیا اور زیارت، کوئٹہ اور کراچی میں قائد اعظم کے آخری قریباً دو ماہ وہ قائد کے قریب رہے۔ اس تقرب کی اہمیت سے واقف ہونے کے سبب انھوں نے ڈائری لکھنے کی حکمتِ عملی اختیار کی جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے:

> Realizing its documentory value I maintained a day to day record of what the Quaid-e-Azam said to me, from the moment he graciously greeted me to the last faint words he utterned, and now I am able to draw upon it.(8)

> ترجمہ: قائداعظم نے مجھ سے جو کچھ کہا اس کی دستاویزی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے میں روزانہ اسے لکھ کر محفوظ کر لیتا تھا۔ جس لمحے انھوں نے میرا پرتپاک خیر مقدم کیا، اس سے شروع ہو کر ان کے کمزور لہجے میں ادا کیے گئے الفاظ تک۔ ان یادداشتوں سے اب میں استفادہ کر سکتا ہوں۔(۹)

ان یادداشتوں کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہو جاتی ہے کہ قائداعظم کوئی عام انسان نہ تھے بلکہ ایک ملک کے بانی اور سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ لاکھوں دلوں کے محبوب قائد بھی تھے۔ ان کی بیماری کی نوعیت اور شدت صیغہ راز میں رکھی گئی جس میں خود قائد کا حکم شامل تھا۔ اس بات نے کئی شبہات اور افواہوں کو جنم دیا یہاں تک کہ ان کی موت کو غیر طبعی بھی کہا گیا۔ ایسے میں کرنل الٰہی بخش کی یہ یادداشتیں تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر جاتی ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ قائد کے سوانح نگار رؤف بلیتھو نے قائد کے آخری ایام کے بیان میں محض کرنل الٰہی بخش کی اس ڈائری اور اس کے مندرجات پر انحصار کیا ہے۔ پہلی بار یہ یادداشتیں کتابی شکل میں ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی طبع دوم ۱۹۷۸ء جبکہ طبع سوم ۲۰۱۱ء میں ہوئی۔ اس کتاب کے متعلق یہ مشہور تھا کہ حکومتِ پاکستان نے اس کو ضبط کر لیا ہوا ہے۔ مترجم نے اس معاملے کی وضاحت پیش لفظ میں کی ہے۔

میری اب تک کی جستجو اور مطالعہ کی رو سے قائداعظم کی موت سازش کا نتیجہ قطعاً نہ تھی۔ چونکہ ہمیں یہ منظور نہیں اس لیے شروع دن سے کرنل الٰہی بخش کی اس کتاب "With the Quaid-e-Azam during his last days" کے بارے میں یہ بات عام رہی، وزیراعظم لیاقت علی خان کے حکم پر یہ کتاب ضبط کر لی گئی تھی، کہ اس میں ان کے بارے میں کچھ ناپسندیدہ باتیں تھیں۔ ۱۹۷۶ء قائداعظم کی صد سالہ سالگرہ کے طور پر منایا جاتا تھا۔ میں نے قائداعظم کے ساتھیوں ورکروں اور کسی مرحلے پر ان کے قریب رہنے والے افراد کی یادداشتوں پر مبنی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا۔ ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جن تک کسی نے رسائی نہ پائی تھی۔ ان انٹرویوز پر مبنی میں نے آتش فشاں کا ۲۳۲ صفحاتی خصوصی نمبر شائع کیا۔ اس میں سید شریف الدین پیرزادہ کا انٹرویو بھی شامل ہے، جو میں نے ان سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۵ء کو کراچی ان کی رہائش گاہ پر کیا تھا۔ جب میں انٹرویو سے فارغ ہوا انھوں نے مجھے کہا، آپ کرنل الٰہی بخش کی کتاب کیوں نہیں چھاپتے؟ میرا جواب تھا وہ کتاب تو ضبط ہے۔ پیرزادہ صاحب نے اس کی تردید کی۔ مجھے اس پر سخت حیرت ہوئی، کیونکہ ہم بچپن سے سن رہے تھے کہ وزیراعظم لیاقت علی خان کے بارے میں کرنل الٰہی بخش نے اس میں کچھ ایسے حقائق افشا کیے کہ انھوں نے یہ کتاب ضبط کرا دی۔ پیرزادہ صاحب کی بات کی تصدیق کے لیے میں نے کراچی میں ڈاکٹروں کی انجمن کے اک بڑے عہدہ دار ڈاکٹر سے صدر، نوید کلینک میں ملاقات کی۔ وہ ڈاکٹر، کرنل الٰہی بخش کے ہم عصر تھے۔ میں نے ان سے پیرزادہ صاحب کی بات کی وضاحت چاہی تو انھوں نے بتایا یہ درست ہے حکومت نے کرنل الٰہی بخش کی یہ تصنیف ضبط نہ کی ہم نے البتہ مطالبہ ضرور کیا تھا، یہ کتاب ضبط کر لی جائے۔ میں نے اس مطالبے کی وجہ پوچھی تو ان کا کہنا تھا، اسے ہم نے اپنے پیشے کے منافی سمجھا کہ ایک ڈاکٹر علاج کے بعد اپنے مریض کو کتاب کا موضوع بنا ڈالے۔(۱۰)

یہ یادداشتیں محترمہ فاطمہ جناح کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کی گئیں اور وہ لکھتی ہیں کہ:

> This brief account of the last few days of physician's contact with the Quaid-e-Azam's indomitable spirit would allay the deep anxiety of a perplexed people, who keenly desire to be acquianted with the Quaid-e-Azam's ailments and the case of his death. It will also set at rest several rumours as to his ill now and the time and place of his death.(11)
>
> ترجمہ: قائداعظم کی ناقابل تسخیر شخصیت کے ساتھ ایک معالج کے آخری چند روزہ رابطے کی یہ مختصر روئداد الجھن کے شکار ان افراد کی وہ گہری تشویش دور کر دے گی، جو قائداعظم کی بیماری اور رحلت کے سبب سے آگاہ ہونے کے شدید خواہاں ہیں۔اس سے ان کی بیماری اور رحلت کے وقت اور جگہ کے متعلق کئی بے بنیاد افواہیں باطل ہو جائیں گی۔(۱۲)

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان یادداشتوں کے ترجمے میں مصنف نے حتی الامکان لفظی ترجمے کی کوشش کی ہے تاکہ حقائق کی تفہیم وتبلیغ میں کوئی کسر نہ رہ جائے مگر وہ ابہام جس کے بارے میں محترمہ فاطمہ جناح کی تمہید اور مترجم کے تعارف یا پیش لفظ میں بات کی گئی ہے اور اس کو مترجم نے پوری کوشش سے واضح کر دیا ہے اور وہی ابہام یادداشتوں کی طبع سوم کی تمہید جو کرنل الٰہی بخش کے صاحبزادے ایم ناصر الٰہی نے تحریر کی ہے، سے پوری شدت کے ساتھ دوبارہ پیدا ہو جاتا ہے۔

> It should be noted here that, based on information available to Dr. Illahi Bakhsh's eldest son, M. Humayun, that there was an initial version of this book which the author had submitted to the Pakistan government for review (as he was a government employee), but which regrettably does not exist any longer. The author was required to delete certain passages from the book as they were considered to be politically inappropriate and sensitive. Essentially, these included, inter alia, information based on the author's close personal relationship with the Quaide, which suggested that the patient was unhappy after some difficult meetings with his close political allies who he felt were departing from

> the cardined concepts of the state of Pakistan that he had begun to visualize. These concepts, included in some of the Quaid's important speeches of the time, emphasized the guiding principles of equality, justice, and fair play for all the citizens of the new State. It is beleived that the author took the view that the Quaid's reaction to these emerging political differences and his possible perceptions about the lack of support for them, may have been one of the factors that contributed to the onset of the Quaid's depressed state. (13)

مترجم نے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد اور تیسرے ایڈیشن سے قبل یہ یادداشتیں یا روزنامچہ ترجمہ کیا۔اس دوران ان کو کرنل الٰہی بخش کے ہم عصر ڈاکٹر اور شریف الدین پیرزادہ سے بات کا موقع ملا اور انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ اگر اس ڈائری کے مندرجات پر کوئی قدغن لگائی گئی ہوتی تو کرنل الٰہی بخش اور فاطمہ جناح دونوں بعد میں بھی زندہ رہے اور اگر اس ڈائری کے مندرجات میں کچھ خلافِ واقعہ لکھا گیا تھا تو وہ اس پر خاموش کیسے رہ سکتے تھے۔چونکہ مترجم ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھنے والی ڈائری کو ترجمہ کر رہے تھے اور ان کا مقصد بھی ان غلط فہمیوں اور افواہوں کا ازالہ کرنا تھا جو قائد کے متعلق مشہور تھیں اور اب تک ہیں لہٰذا ان کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ کرنل الٰہی بخش کے بچوں سے ملتے اور اس سوال کا جواب لیتے۔کیونکہ کرنل الٰہی بخش اپنی سرکاری ملازمت اور اس کے بعد اپنے پیشہ ورانہ ضابطہ اخلاق کے پابند ہونے کے سبب بھی تو خاموش رہ سکتے تھے لیکن یہ پابندی ان کے بچوں پر لاگو نہیں ہوتی جیسا کہ انھوں نے طبع سوم کے دیباچے میں کھلم کھلا اس کا اظہار بھی کیا۔مزید برآں کرنل الٰہی بخش نے ایک عجیب اور حیرتناک بات لکھی ہے۔مصنف لکھتے ہیں:

> On the morning of the 29th of August, after examining the Quaid-e-Azam, I expressed the hope that he would live long enough to see the state he had brought into being fully and firmly established. I could not have predicted his response to my sentiments. 'You Know' he said, 'when you first came to Ziarat, I wanted to live, adding in an infinitely disillussioned tone, 'Now, however, it does not matter wether I live or die. I noticed tears in his eyes and was startled by this manifestation of feeling in one generally looked upon as unemotional and

unbending. I could not, moreover, account for his dejection at a time when he had been making excellent progress in all respects, and ventured to seek enlightenment from him. The explanation he offered that he had completed his job, but I found it enigmatic and evasive. Was his job incomplete five weeks ago, and had he done something in the meanwhile which had given him a sense of fulfilment? I could nto help feeling that someting had happened which undermined his will to live? I could not help feeling that something had, happened which undermined his will to live.(14)

ترجمہ: ۲۹ اگست کی صبح قائداعظم کا معائنہ کرنے کے بعد میں نے توقع ظاہر کی کہ جس ملک کو وہ وجود میں لائے ہیں، اسے پوری طرح اور مضبوطی سے استوار ہوتا دیکھنے کے لیے وہ تا دیر زندہ رہیں گے۔ میں اپنے نقطۂ نظر پر ان کے ردِعمل کی پیش گوئی نہیں کر سکتا تھا۔ انھوں نے کہا ''آپ کو پتہ ہے جب آپ پہلے پہل زیارت آئے تھے میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔'' یہ کہہ کر انھوں نے اپنے لہجے کو انتہائی دوٹوک انداز دیتے ہوئے کہا ''تاہم اب میں زندہ رہوں یا نہ رہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا'' میں نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ اور اس ہستی میں اس احساس کے آشکار پر میں چونک اٹھا، جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ غیر جذباتی ہیں اور جھکنا نہیں جانتے۔ مزید برآں میں اس وقت اس افسردگی کی توجیہہ نہیں کر سکتا تھا جب وہ ہر لحاظ سے بہتر ہو رہے تھے اور میں نے ان سے روحانی بصیرت پانے کی ہمت کی تھی۔ انھوں نے اس کی وضاحت یہ کی کہ وہ اپنا کام مکمل کر چکے ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ ایک معما اور گریز تھا۔ کیا پانچ ہفتے قبل ان کا کام نامکمل تھا؟ کیا اس اثنا میں انھوں نے کچھ ایسا کام کیا کہ جس سے انھیں اس کے مکمل ہونے کا احساس ہو گیا؟ میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ کچھ ہوا ہے جس نے ان میں جینے کی امنگ کمزور کر دی۔(۱۵)

ان صفحات میں مصنف نے ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا ہے جو پچھلے تمام تر واقعات کے بالکل الٹ ہے۔ یہاں آ کر قاری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے اور تشنگی محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ یہ الجھن خود کرنل الٰہی بخش کے ذہن میں بھی موجود ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس دن سے ایک آدھ دن قبل کچھ ایسا ہوا ہے جس نے قائداعظم جیسے اولو العزم اور بلند حوصلہ شخص سے جینے کی امنگ چھین لی ہے۔ ڈائری میں اس سے ایک دن قبل کی روداد نہیں ہے۔ گمان کیا جا سکتا ہے کہ اگر ایسا کوئی تذکرہ تھا بھی تو اس کو کرنل الٰہی بخش کے بیٹے کے بیان کے مطابق ان صفحات میں

سمجھا جا سکتا ہے جنھیں حکومتِ وقت نے نامناسب اور سیاست دانوں کے لیے مضر سمجھ کر نکال دیا تھا۔

مصنف کے چھپائے گئے اسماء جنھیں وہ کسی مجبوری کے تحت ظاہر نہ کر سکا کی ایک مثال باب دوم میں یوں موجود ہے:

> One day Mr. Amin came and asked me if "I could allow a very important visitor to meet the Quaid-e-Azam. I told him nothing was more important than the Quaid-e-Azam's life and I could not let anyone meet him. After an hour or so Mr. Amin came again with the same request, pleading that the visitor had a very vital matter to discuss with the Quaid-e-Azam. I asked his name, but Mr. Amin said he could not disclose it. Again I refused. Later, in Karachi, after the Quaid-e-Azam's death, i found the identity of the visitor, and was glad that the interview had not been allowed to take place: it would certainly have upset the Quaid-e-Azam, and might have hastened his death. What effects, the meeting would have had on the course of political events it is not possible to guess, for no one could surmise what advice he would have given to the visitor.(16)

منیر احمد نے بھی ترجمے میں اس بات کو بعینہٖ بیان کیا اور لکھا:

> ایک روز مسٹر امین میرے پاس آئے اور پوچھا، کیا آپ ایک بہت اہم ملاقاتی کو قائداعظم سے ملنے کی اجازت دیں گے؟ میں نے انھیں بتایا کہ قائداعظم کی زندگی سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں۔ میں کسی کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ بعد وہ اسی گزارش کے ساتھ دوبارہ آئے۔ انھوں نے منت کی کہ ملاقاتی نے قائداعظم کے ساتھ ایک انتہائی اہم معاملے پر گفتگو کرنی ہے۔ میں نے ان صاحب کا نام پوچھا تو مسٹر امین نے کہا، وہ ان کا نام ظاہر نہیں کر سکتا۔ میں نے دوبارہ انکار کر دیا۔ قائداعظم کی وفات کے بعد کراچی میں جب مجھے ملاقاتی کی بابت پتہ چلا تو مجھے خوشی ہوئی کہ اچھا ہی ہوا جو میں نے اسے ملاقات کی اجازت نہ دی، اس سے قائداعظم یقیناً بہت پریشان ہوتے۔ ہو سکتا ہے اس سے قائداعظم کا آخری وقت تیزی سے قریب آ جاتا۔ سیاسی واقعات کی رفتار پر اس میٹنگ کا کیا اثر پڑتا، اس کا اندازہ کرنا ممکن نہیں، کیونکہ کوئی بھی قیاس نہیں کر سکتا تھا کہ قائداعظم ملاقاتی کو کیا مشورہ دیتے۔ جہاں

> تک میرا تعلق ہے میرے سامنے جس چیز کی اہمیت تھی وہ وہی تھی جو ایک ڈاکٹر اپنے مریض کے لیے ملحوظ رکھتا ہے۔(۱۷)

یہ ملاقاتی کون تھا؟ اس کا نام مصنف نے تو کہیں بھی ظاہر نہیں کیا۔تو کیا مترجم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس ملاقاتی کا نام معلوم کرنے کی کوشش کرے اور قارئین تک پہنچائے۔اس کا جواب یقیناً نہیں ہے۔لیکن اس مخصوص کتاب کے ضمن میں شاید یہ ضروری سمجھا جانا چاہیے کیونکہ مترجم نے ترجمے کا مقصد ہی حقائق کو قارئین تک پہنچا کر چند غلط فہمیوں اور افواہوں کا ازالہ کرنا لکھا ہے۔لہٰذا اس صورت میں وہ اپنے ترجمے کے مقاصد کا اخلاقی طور پر پابند ہے۔اس استثنیٰ کے علاوہ باقی صورتوں میں مترجم اپنی صرف سے وضاحت کر دے تو وہ حاشیے میں لکھی جائے گی۔ورنہ وہ ایسی معلومات کی فراہمی کا پابند نہیں ہے بلکہ محض متن تک محدود رہنا زیادہ بہتر ہو گا۔

مذکور اصناف کے ترجمے کی راہ میں حائل ایک اور لسانی رکاوٹ مصنف کی شخصی زبان اور تکیہ کلام وغیرہ کا استعمال بھی ہے جن کی عدم تفہیم اگر غلط ترجمے کا سبب بن سکتی ہے تو ان سے صرفِ نظر صاحب کتاب کی شخصیت کو چھپا سکتا ہے۔کسی بھی لفظ کے معانی محض وہ نہیں ہو سکتے جو لغت میں لکھے مل جائیں:

> معانی میں ہمارے تجربات، ثقافت، تصورات، اور مشروطیت سے رنگ بھرتے ہیں۔ہم کسی بھی لفظ یا پکار کو جو ممکنہ معانی عطا کرتے ہیں وہ محض لغت کی خشک تعریفوں کے ساتھ ان باتوں پر بھی منحصر ہوتے ہیں۔یہ مجھ پر تب کھلا جب معنیات کی کلاس کے ایک طالب علم نے مجھ سے کہا کہ عموماً لوگ جب لفظ Occupation سنتے ہیں تو ان کے ذہن میں پہلی سوچ ان کی ملازمت کی آتی ہے۔تاہم جب وہ طالب علم اس لفظ کو سنتا ہے تو اسے دراندازی کا نشانہ بننے کی سوچ آتی ہے۔کیونکہ وہ ایک فلسطینی ہے۔(۱۸)

اسلوب کی تین بنیادی اقسام یعنی شخصی اسلوب، اس عہد کا اسلوب اور صنف کا اسلوب بعض اوقات مل کر اپنا جادو جگاتی ہیں اور بعض اوقات انفرادی طور پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔اسلوب کی تین اقسام کے ملاپ کا مظاہرہ تو ہم عموماً مصنف کی ان تحریروں میں دیکھتے ہیں جو اس نے اپنے فن کے اظہار کے لیے لکھی ہیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ صاحب کتاب کوئی مصنف یا ادیب ہو۔آپ بیتی لکھنے والے افراد کا دائرہ انسانیت کے دائرے جتنا ہی وسیع ہے جس میں ہر میدان کے ممتاز افراد اپنی خودنوشت لکھ سکتے ہیں۔یا ان کی یادداشتوں اور ڈائریوں کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ایسی صورت میں مترجم کے لیے مصنف کی زبان اور اسلوب کو سمجھنا کارِ محال ہو جاتا ہے۔ایسے میں یادداشتوں، ڈائری یا خودنوشت کا ترجمہ محض متن کی مدد سے نہیں کیا جائے گا۔مترجم کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مطلوبہ شخص کے بارے میں جتنا مواد پڑھ سکتا ہے، پڑھ لے تاکہ اس کے لیے متن کی تفہیم اور ترجمانی ممکن ہو سکے۔مترجم کسی بھی متن کا مصنف تو بعد میں بنتا ہے پہلے وہ اس کا قاری ہوتا ہے جو اس متن کی تفہیم کی بنیاد پر اسے پسند کرتا اور دوسروں تک اس کے فکر وفن کی تمام تر خوبیاں یا خامیاں پہنچانا چاہتا ہے جب تک اس متن کے اولین قاری کی حیثیت سے وہ اس متن کی تمام یا ممکن حد تک معنوی ولسانی تہوں سے واقف نہ ہو جائے وہ ترجمانی

کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا۔

خودنوشت بہت حد تک صنفی اور عصری اسلوب کے تقاضے پورے کرتی ہوئی صنف ہو سکتی ہے لیکن ڈائری اور یادداشتوں کے ترجمے کو دودھاری تلوار پر رقص کے مترادف سمجھنا چاہیے کہ نہ صرف اصل کے اسلوب اور حقائق کو برقرار رکھنا ہوتا ہے بلکہ اس ضمن میں اپنے ذاتی علم اور تعصبات کو نظر انداز کرنا بھی مترجم ہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔

خودنوشت سوانح عمری کا ترجمہ چونکہ کچھ مخصوص اہداف کے زیر اثر کیا جاتا ہے لہٰذا ان اہداف کی نوعیت مترجم سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ قارئین کی رائے پر اثر انداز ہونے کے لیے کوئی حکمتِ عملی اپنائے۔ متن کے ترجمے میں مقصود تبدیلیوں اور واقعات وحقائق کی اپنی مرضی کے مطابق تدوین کے بعد بھی اگر مترجم ان مقاصد کے حصول کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل سمجھے تو قارئین کی رائے اور متن کی قرأت کی ہدایت کاری کا طرزِ عمل اختیار کرنے سے بھی باز نہیں آتا اور بعض اوقات اگر متن کا ترجمہ ایک سے دوسری جگہ یا ملک میں طبع ہونے لگے تو اس مملکت کے ناشر کے اغراض ومقاصد بھی اس ہدایت کاری کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ہٹلر کی آپ بیتی ''میری جدوجہد'' کے ترجمے کی ہے۔ بھارت میں اس کا ترجمہ نارائن نے کیا اور پیش لفظ میں ان تمام اہداف و اسباق کی وضاحت کی جو ترجمے کی قرأت سے مقصود تھے۔ یہی ترجمہ جب پاکستان میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا تو ڈاکٹر مبارک علی نے اس پر تعارف لکھا اور قارئین کو چند مزید ایسے اسباق اور سوچنے کے زاویے دکھائے جو پاکستانی ناشر کے پیش نظر تھے۔ یوں ہٹلر کی یہ آپ بیتی محض ہٹلر کی سوانح نہیں رہ جاتی اور نہ ہی قاری کے سامنے اس طور پر پیش ہوتی ہے کہ وہ اس کو پڑھ کر ہٹلر کے لیے اپنی رائے کی تشکیل کرے بلکہ حتی الامکان ان تمام راستوں کو مسدود کر دیتی ہے جو ہٹلر کی تفہیم کے لیے قاری کے ذہن میں کھل سکتے ہیں۔

اڈولف ہٹلر کی آپ بیتی ''میری جدوجہد'' کے مترجم نارائن نے محض اپنے ترجمے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کتاب سے مقصود اسباق کو بھی پیش لفظ میں بیان کیا ہے۔ مثلاً ہٹلر سے دنیا کی عمومی نفرت کا ذکر کرنے بعد لکھا ہے کہ اس سب کے باوجود

> ....ایک ہوشیار اور دانشمند آدمی کو ہر شخص اور ہر جگہ سے نصیحت حاصل کرنی چاہیے۔ خواہ وہ دیوار پر ہی کیوں نہ لکھی ہو۔(۱۹)

حب الوطنی کا جذبہ اور اپنی سرزمین وطن سے وفاداری کی تلقین ہٹلر کے کردار سے سیکھی جانی چاہیے۔

> جو کمزور قومیں بین الاقوامیت کے طلسم میں پھنس کر اپنی قومی، بشری اور بہبودی کی طرف سے لاپرواہ اور غافل رہتی ہیں وہ نہ تو قومی طور پر مضبوط اور طاقتور ہو سکتی ہیں اور نہ بین الاقوامی طور پر ہی انھیں کبھی کوئی عزت اور طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ زیکوسلاوکیہ کی نظیر زبانِ حال سے پکار پکار کر دنیا کو یہ سبق دے رہی ہے کہ کبھی بین الاقوامیت کے بھروسے پر اپنی قوم کے دوسرے حصوں یا اپنے ہمسایوں سے دشمنی یا عناد کا خیال تک بھی اپنے دل میں نہ لاؤ۔ ورنہ تمہارا انجام بھی یہی ہوگا جو آج میرا (یعنی زیکوسلواکیہ) کا ہوا ہے۔(۲۰)

> دوراندیش اور دانشمند مصنف نے متذکرہ بالا امور کے علاوہ لازمی اور جبری قومی وفوجی تعلیم کی ضرورت مذہب وسیاسیات کی علیحدگی زراعت وکاشتکاری کی اہمیت وغیرہ وغیرہ مضامین پر جن مدبرانہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی خاص طور پر قابلِ غور ہیں اور زراعتی پالیسی کے متعلق تو اس نے جو پروگرام کتاب کے آخر میں دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہر ایک قوم پرست حکومت اسے اپنے پیشِ نظر رکھے اور اپنے مقامی حالات کے مطابق اس میں مناسب ترمیم وتنسیخ کر کے اس کی زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک پیروی کرنے کی کوشش کرے۔(۲۱)

گویا نارائن نے بھارت میں اس آپ بیتی کے ترجمے سے پیشِ نظر وہ تمام مقاصد بتائے جن پر وہ چاہتے ہیں کہ قارئین ان پر خصوصی نظر کریں بلکہ اگر ہو سکتے تو انھی تک محدود رہیں۔

پاکستان میں یہ آپ بیتی فکشن ہاؤس کے زیرِ اہتمام لاہور میں چھپی۔اور ڈاکٹر مبارک علی ''تعارف'' میں رقمطراز ہیں:

> ہمارے ملک کے جو حالات ہیں ان میں ہٹلر کی ''میری جدوجہد'' کا مطالعہ ہمارے تاریخی شعور میں اضافہ کرے گا، اس سے اندازہ ہوگا کہ کس طرح قوم اور ملک کے نام پر لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا جاتا ہے اور ان کی ہمدردیاں آمرانہ حکومت کے لیے حاصل کی جاتی ہیں۔ان سے یہ بھی اندازہ ہوگا کہ مذہبی ونسلی اقلیتوں کو کس طرح سارے مسائل کا ذمہ دار ٹھہرا کر ان سے نفرت کی جاتی ہے اور ان کے خلاف تشدد کو بھڑکایا جاتا ہے، کس طرح سے سیاسی جماعتوں کو ملک دشمن ٹھہرا کر ان کے خلاف کارروائیاں کی جاتی ہیں اور کس طرح اپنے مخالفوں کو غیر ملکی ایجنٹ ٹھہرا کر انھیں اذیتیں دی جاتی ہے۔اس سے یہ بھی سبق ملتا ہے کہ فوجی آمرانہ حکومتوں نے کسی نہ کسی نظریہ کا سہارا لے کر جابرانہ حکومتوں کو قائم کر کے لوگوں کو غلام بنا کر ان کی آزادی اور جذبوں کو ختم کیا ہے اور نتیجہ میں خود بھی تباہ ہوئے ہیں اور ملک وقوم کو بھی تباہ کر دیا۔اس لیے قوموں کی ترقی ایک ایسے نظام میں ممکن ہے جو جمہوری اور سیکولر ہو اور جس میں قوت برداشت اور رواداری ہو۔اس لیے ہمیں اپنے حالات کو بہتر کرنے کے لیے کسی ہٹلر کسی مسولینی کی ضرورت نہیں بلکہ جمہوری نظام کی ضرورت ہے جو کہ عوام کی امنگوں کا آئینہ دار ہو۔(۲۲)

پاکستان کے سیاسی منظرنامے اور ملکی تاریخ میں شخصی اور آمرانہ حکومتوں کو جمہوری حکومتوں کے مقابلے میں خاصا استحکام اور طویل عرصہ حاصل رہا ہے۔لہٰذا یہاں کے عوام کا ایک ذہنی رویہ اور رجحان آمرانہ حکومتوں کے لیے نرم گوشے کا سا ہے۔اس رجحان کی مذمت اور حوصلہ شکنی ضروری ہے۔لہٰذا مبارک علی نے اس زاویہ نظر کو خصوصی توجہ دینے کی ہدایت کی نیز ہٹلر کے کردار کو ہیرو کے بجائے اینٹی ہیرو کے طور پر پڑھنے کی تلقین کی۔

ترجمے کا اگلا مسئلہ مصنف کی جانب سے واقعات کی توڑ مروڑ کر پیش کی گئی شکل، حقائق کا اخفاء یا ابہام پیدا

کر دیتا ہے۔ یہ ابہام عملاً بھی ہو سکتا ہے اور غیر ارادی طور پر بھی۔ یعنی ممکن ہے کہ مصنف نے کسی واقعے کو اپنی ڈائری میں نوٹس کی شکل میں لکھا ہو یا چند رہنما الفاظ کلید کے طور پر لکھ دیے ہوں جو خود اس کے لیے تو یادداشت اور تفہیم میں مسئلہ پیدا نہ کریں لیکن قاری ان الفاظ میں کوئی ربط تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ مترجم کے لیے شاید یہ مسئلہ براہِ راست عمل کرنے کا موقع ہو۔ اگر وہ راست اقدام نہ کرے اور ان الفاظ کی وضاحت نہ کرے تو کیا ترجمانی کا حق ادا ہو سکتا ہے؟ ایسی صورت میں یقیناً مترجم محض لفظی سطح پر ترجمے سے آگے بڑھ جائے گا لیکن یہ بہرحال اس کا حق نہیں کہ وہ اپنی وضاحت کو متن کے ترجمے کا اس طرح حصہ بنا دے کہ قاری اس کو بھی مصنف ہی کی تحریر سمجھ لے، بلکہ یہاں مترجم اپنے اس علم کو یا تو قوسین میں بحوالہ مترجم لکھے گا یا حاشیے میں اس کی وضاحت کرے گا تا کہ قاری کو یہ بات واضح رہے کہ یہ مترجم کی کاوش ہے اور اصل متن کا حصہ نہیں ہے۔

ڈائری، خودنوشت یا یادداشتوں میں اگر کسی واقعے کو توڑ مروڑ کر یا کسی اور نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے اور مترجم کے علم میں اس کی کوئی دوسری صورت یا دوسرا رخ بھی ہے تب بھی مترجم کو حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ وہ متن سے وفادار رہے۔ مثلاً خودنوشت سوانح نگار کے ہاں صیغہ واحد متکلم کا بہت زیادہ استعمال اور حالات و واقعات کے بیان میں اپنی ذات کو غیر معمولی اہمیت دینے کا رجحان۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری لکھتے ہیں:

> لفظ ''میں'' کی یہ تکرار ان حالات و واقعات کے ذکر میں قاری کو خاص طور پر گراں گزرتی ہے جن میں سوانح نگار کا عمل دخل ایک عام تماش بین سے زیادہ نہیں ہوتا پھر بھی جب وہ اپنے پرانے سکول، کالج یا یونیورسٹی کے کسی ادبی جلسے یا مشاعرے وغیرہ کا تذکرہ مفصل روداد کی صورت میں اسی طرح کرتا ہے جیسے وہ ان واقعات کا میر کارواں رہا ہو حالانکہ ان واقعات کی تفصیلی روداد سوانح نگار کے لکھنے سے بہت پہلے دوسرے اہلِ قلم لکھ چکے ہوتے ہیں اور رپورتاژ یا مقالات و مضامین کی صورت میں شائع ہو کر قارئین کے مطالعے میں کب کے آ چکے ہوتے ہیں۔(۲۳)

یہ صورت حال زیادہ گمبھیر تب ہو جاتی ہے جب مصنف کسی قومی یا سیاسی سطح کا فعال رکن ہو۔ اس کی طرف سے واقعات کی یہ ترمیم اپنی حیثیت کو واضح کرنے اور خود کو بری الذمہ کرنے کی ایک کوشش یا کسی اور کی محنت کو اپنے مقام کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے نام کرنے کی بالارادہ سعی بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت حال میں کیا مترجم کو محض ترجمان ہی رہنا چاہیے یا ایک قدم آگے بڑھ کر سچ اور جھوٹ کی نشاندہی کر دینی چاہیے؟ مترجم مؤرخ نہیں ہوتا نہ ہی وہ سچ اور جھوٹ کا پارکھ ہوتا ہے اس کا کام تو مورخین اور ناقدین کے ساتھ ساتھ محققین اور قارئین کے سامنے بنیادی متن لانے کا ہوتا ہے۔ کسی کے بیان کردہ تاریخی حقائق کے سچ جھوٹ کی پرکھ کا کام مترجم کے علاوہ باقی تمام قارئین پر چھوڑ دینا چاہیے۔ مترجم اپنے حصے کا کام کرے اور دوسروں کو ان کے حصے کا کام کرنے دے۔ مختلف متون کا تقابلی مطالعہ کر کے حقائق کی درستی کا کام مترجم کا نہیں ہاں البتہ ترجمے کے لیے مستند ترین متن کے حصول کے لیے وہ مختلف متون کا مطالعہ کرنے کا پابند ضرور ہے۔

اس کی ایک مثال ''آپ بیتی ابنِ خلدون'' کے مترجم سعود خان روہیلہ کے الفاظ میں دی جا سکتی ہے جو اگرچہ عربی سے اردو میں ترجمہ کی گئی آپ بیتی ہے مگر رہنما اصول چونکہ عمومی ہوتے ہیں لہٰذا ایک ہی کتاب کے دستیاب مختلف متون کے تقابلی مطالعے کا ذکر مترجم نے تعارف میں یوں کیا ہے:

> تاریخ ابنِ خلدون کا ترجمہ مولانا حسین الٰہ آبادی نے کیا تھا لیکن اس میں خودنوشت کا حصہ شامل نہ تھا۔ ان کا ترجمہ جب نفیس اکیڈمی کراچی نے شائع کیا تو باقی ماندہ حصے کا بھی ترجمہ کروایا اور خودنوشت کا ترجمہ مولانا اختر جوناگڑھی نے کیا۔ اس ترجمے میں دو نقص ہیں۔ اول یہ کہ بولاق کے ایڈیشن سے لیا گیا ہے لہٰذا جو غلطی بولاق کے متن میں تھی وہ اردو میں بھی ہو گی۔ مثلاً ابن خلدون کے سب سے اہم استاد ''الآبلی'' کا نام بولاق میں ہر جگہ ''ایلی'' چھپ گیا ہے۔ مولانا جوناگڑھی کے ترجمے میں بھی یہ ایلی ہی چھپا ہے۔ دوسری یہ کہ یہ ترجمہ بعض جگہ پر لفظی ترجمے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ نیز اسم ہائے ضمیر کے استعمال سے پیشِ نظر کردار کو جاننے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ خودنوشت کا اردو کا وہ ترجمہ نامکمل نسخوں کی طرح ۷۹۷ھ/ ۱۳۹۵ء پر ختم ہو جاتا ہے اور اس میں ابن خلدون کی زندگی کے آخری بارہ سال کا حال درج نہیں ہے۔ خاص طور پر فتنۂ ناصری اور امیر تیمور سے ملاقات کا جو کہ بہت اہم موضوعات ہیں۔ زیرِ نظر ترجمہ میں آپ یہ نقائص نہیں پائیں گے۔ یہ کتاب اس کی خودنوشت کے کامل ایڈیشن سے ترجمہ کی گئی ہے۔ (۲۴)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مترجم کے لیے ایک طرح کا فنی محقق و نقاد ہونا ضروری ہے۔ ترجمہ کوئی کم اہم اور نسبتاً غیر ذمہ دارانہ عمل نہیں ہے بلکہ مترجم سے کل وقتی ہوشیاری اور نقادانہ نظر کا طالب پر مشقت عمل ہے۔

واقعات کے بیان میں ابہام کی نوعیت لسانی بھی ہو سکتی ہے اور یہ ابہام عملاً یا غیر ارادی ہو سکتا ہے۔ چونکہ مترجم مصنف کی نیت سے تو واقف نہیں ہو سکتا کہ ابہام جان بوجھ کر پیدا کیا گیا ہے یا الفاظ کا استعمال بے دھیانی میں یا غیر ارادی طور پر ایسا ہو گیا کہ وہ واقعات کے بیان کو مبہم بنا گیا ہے۔ ایسی صورت میں کیا مترجم اس ابہام کو قائم رکھے؟ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ مترجم ہر ممکن حد تک اصل متن کی پیروی کا پابند ہے، بصورت دیگر حاشیے میں اپنے فہم کا اظہار کرنے کا راستہ تو کھلا ہی ہے۔

حوالہ جات :

(۱) سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اردو میں آپ بیتی''، مشمولہ **اردو نثر کا فنی ارتقاء** ڈاکٹر فرمان فتح پوری، لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ص ۳۵۱

(2) Lefever Andre, Translation, ***Rewriting & The Manipulation of Literary Fame***, P.5

اصل متن یہ ہے:

> "... rewriters created images of writer, a work, a period a genre, sometimes even a whole literature. These images existed side by side with the realities they competed with, but the images always tended to reach more people than the corresponding realities did, and they most certainly do so now ------ rewritings are produced in the service, or under the constraints, of certain idealogical and / or poetological currents."

(۳) سید علاؤالدین، مترجم، **چارلس ڈارون کی خود نوشت**، کراچی: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۰۸ء، ص ۷

(۴) ایضاً، ص ۳۸

(۵) Lefever Andre, P.59-72

(۶) سید عبداللہ، ڈاکٹر، ''اردو میں آپ بیتی''، محولہ بالا، ص ۳۵۹

(۷) ایضاً، ص ۳۵۲

(8) LT. Colonel Ilahi Baksh, ***With the Quaid-e-Azam during his last days***, Karachi: Oxford University Press, 2011, P.4

(۹) کرنل الٰہی بخش، مترجم منیر احمد منیر، ''قائداعظم کے آخری ایام''، ماہنامہ **آتش فشاں**، لاہور: ۲۰۱۰ء، ص ۴۰

(۱۰) منیر احمد منیر مترجم، ''قائداعظم کے آخری ایام''، محولہ بالا، ص ۳۱

(11) LT. Colonel Ilahi Baksh, ***With the Quaid-e-Azam during his last days***, P.VIII

(۱۲) منیر احمد منیر، مترجم، ''قائداعظم کے آخری ایام''، ص ۱۱

(12) LT. Colonel Ilahi Baksh, ***With the Quaid-e-Azam during his last days***, P.XVII

(14) LT. Colonel Ilahi Baksh, ***With the Quaid-e-Azam during his last days***, P.39

(۱۵) منیر احمد منیر، مترجم، ''قائداعظم کے آخری ایام''، ص۸۲

(16) LT. Colonel Ilahi Baksh, ***With the Quaid-e-Azam during his last days***, P.49

(۱۷) منیر احمد منیر، مترجم، ''قائداعظم کے آخری ایام''، ص۹۱

(18) Winkler, Elizabeth, Grace, ***Understanding languages, A basic course in Linguistics Continuum International Publishing Group*** New York: London, First South Asian Edition, 2008, P.150

اصل متن یہ ہے:

> "Meaning is also coloured by our experiences, culture, perceptions and conditioning. What possible association we give do a word or utterance is dependent on this as a as dry dictionary definitions. This was brought home to me when a student in a sementics clan pointed out that when most people hear the word accupation, their first thought is of their job. However, when this student hears it he thinks of being invaded because he is palestinian."

(۱۹) تا رائن، مترجم، **میری جدوجہد**، لاہور: فکشن ہاؤس مزنگ، ۱۹۹۴ء، ص۱۳

(۲۰) ایضاً ، ص۱۵

(۲۱) ایضاً ، ص۱۷، ۱۸

(۲۲) ایضاً ، ص۸، ۹

(۲۳) فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، **ادبی تنقید کے نئے دریچے**، لاہور: الاعجاز پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء، ص۱۵

(۲۴) سعود الحسن خان روہیلہ (مترجم)، **آپ بیتی ابن خلدون**، کوئٹہ: غزنوی کتب خانہ، ص۲۱-۲۲